

تعارف و تبصرہ

پروفیسر میاں انعام الرحمن*

”موجودہ عالمی استعماری صورتِ حال اور فیض کی شاعری“

پاکستان میں اقبال کے بعد جن شعر کو قبولیت عام ملی ہے، ان میں فیض احمد فیض نے نئی نسل کو غالباً سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ فیض نے دستِ یاب صورتِ حال میں (in the given situation) جس متانت و سنجیدگی اور مدھر و دھیمے لہجے میں ترقی پسندانہ خیالات کا شاعرانہ اظہار کیا، تمام حلقوں نے ہمیشہ اس کا اعتراف اور احترام کیا ہے۔ حکومت پاکستان نے ۲۰۱۱ کو فیض کا سال قرار دیا ہے۔ اکادمی ادبیات نے اس سلسلے میں فیض کا نفرنس منعقد کر کے فیض احمد فیض کو خراج تحسین پیش کرنے کی قابلِ قدر کوشش کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کانفرنس میں پڑھے گئے مقالات فیض کو خراج تحسین کے بجائے ’خراج‘ ادا کرنے کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ خراجیات کے اس شکوے کی تدوین و ترتیب کا ’شرف‘ یونیورسٹی آف گجرات کے ایڈیشنل رجسٹرار شیخ عبدالرشید صاحب کو حاصل ہوا ہے اور اسے سہواً ”موجودہ عالمی استعماری صورتِ حال اور فیض کی شاعری“ کا عنوان دیا گیا ہے۔ پونے تین سو (۲۷۵) صفحات کی کتاب میں بمشکل پانچ سات صفحات ہی ایسے ہیں جو دل فریب عنوان سے تو مناسبت رکھتے ہیں۔ ہم جیسے، ادب سے واجبی سی دلچسپی رکھنے والے موسمی نقاد بھی (جنہیں بآسانی غیر موسمی قرار دیا جاسکتا ہے) یہ بات جانتے ہیں کہ کسی ادبی صنف کو اپنا آپ منوانے میں برسوں لگتے ہیں، لیکن خراجیات کا یہ شکوہ ایک ہی کانفرنس میں کچھ اس طرح پڑکا ہے کہ کریڈٹ لینے کی خاطر چار حریف لپکے جا رہے ہیں۔ (۱) مقالہ نگار حضرات، (۲) اکادمی ادبیات، (۳) حکومت پاکستان، (۴) یونیورسٹی آف گجرات۔ اگر فیض حیات ہوتے تو شاید پانچویں حریف وہ خود ہوتے۔

مقالات کے بین السطور مقالہ نگار حضرات مصر ہیں کہ خراجیات کا شکوہ انہی کا مرہونِ منت ہے۔ اکادمی ادبیات کا جوابی اصرار یہ ہے کہ کانفرنس کا انعقاد نہ ہوتا تو یہ شکوہ کیونکر ظہور پذیر ہوتا؟ کچھ اسی قسم کا دعویٰ حکومت پاکستان کا ہے کہ ۲۰۱۱ کو فیض کا سال قرار نہ دیا جاتا تو اکادمی ادبیات کو فیض کانفرنس کا خیال تک نہ سوجھتا۔ ان تینوں کی چپقلش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یونیورسٹی آف گجرات کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر محمد نظام الدین نے خراجیات کے شکوے کو اپنی یونیورسٹی کے احاطے سے اٹھکیا کرتے تاڑ لیا ہے۔ موصوف اسے رجھانے بلکہ ورغلانے کی کوشش میں ہیں، دیکھیے ذرا:

”فیض احمد فیض کے صد سالہ یومِ ولادت اور سالِ فیض کی مناسبت سے یہ پاکستان کی ڈیڑھ سو کے لگ بھگ

* شعبہ سیاسیات، گورنمنٹ اسلامیہ پوسٹ گریجویٹ کالج گوجرانوالہ۔ inaam1970@yahoo.com

———— ماہنامہ الشریعہ (۵۴) مئی ۲۰۱۱ ————

جامعات میں سے پہلی یونیورسٹی ہے جس نے انہیں یاد کرتے ہوئے کتابی صورت میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔
'فیضیات' کے حوالے سے یہ کتاب پیش کرنے کا اعزاز حاصل کرتے ہوئے مجھے طمانیت و فخر کا احساس ہو رہا ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب فیضیات کے ضمن میں اہم حوالہ ثابت ہوگی۔“ (ص ۱۱)

ڈاکٹر صاحب انارڑی نکلے۔ ان کے قلم کی لغزش (slip of the pen) نے ایک نئی ادبی صنف متعارف کروانے کا کریڈٹ کھودیا ہے۔ افسوس صد افسوس! نوکِ قلم نے خراجیات کے بجائے فیضیات لکھ دیا ہے۔ اگر وائس چانسلر صاحب سے یہ غیر شعوری غلطی (slip of the mind) نہ ہوتی تو قوی امید تھی کہ خراجیات کا یہ شگوفہ گجرات یونیورسٹی کے نام ہو جاتا اور یونیورسٹی کے لیے بنیادی حوالے کی چیز بھی بن جاتا۔

اس انوکھے شگوفے کو اکادمی ادبیات کے کھاتے میں ہرگز نہیں ڈالا جاسکتا کیونکہ اس نے وہی کام کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ یہ تو مقالہ نگاروں کا اپنے کام سے (بزبانِ فیض) عشق ہے جس کی وجہ سے ایک نئی ادبی صنف 'خراجیات' ایک شگوفے کے مانند چمک کر سامنے آگئی۔ اس ادبی صنف کے مطالعے سے پہلے ہمارا گمان تھا کہ ترقی پسندی اور حقیقت پسندی ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ لیکن اکادمی ادبیات نے مقالہ نگاروں کو، استعاریت کے مفاہیم سے روشناس کرائے بغیر، موجودہ عالمی صورت حال کا ادراک کرائے بغیر، اور تو اور فیضیات کے ضمن میں چند اہم کتابیں پڑھوائے بغیر، اس پر متمرکز مقالہ نگاری کی مشق کا اہتمام کیے بغیر فیض کانفرنس منعقد کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نئی ادبی اصناف کی اختراع محض ترقی پسندانہ حقائق سے ممکن نہیں، بلکہ مقالہ بازی کو فروغ دینے والے مقالہ نگاروں کے طفیل ہی اذہان میں مدفون ایسے خزانے باہر لائے جاسکتے ہیں جنہیں بعد ازاں بڑی آسانی سے خراجیات جیسا 'معتبر' نام دیا جاسکتا ہے۔

اب یہ شگوفہ پھوٹ نکلا ہے تو دیکھتے ہیں کہ فیض احمد فیض کے بعد کس ترقی پسند کے ساتھ حقیقت پسندی کا سلوک کیا جاتا ہے۔ فی الحال اس سلوک کا مستحق فیض ہی بٹھیرے گا کہ حکومت پاکستان نے ۲۰۱۱ کو فیض کا سال قرار دیا ہے۔ آپس کی بات ہے، اگر بھٹو کیس ری اوپن کرنے سے پہلے سالِ فیض کی مناسبت سے پنڈی سازش کیس ری اوپن کیا جاتا تو تاریخ کی درستی، تاریخی درستی کے ہمراہ سامنے آجاتی اور تاریخ کی درستی کی ایک فضا بھی تیار ہو جاتی جس میں بھٹو کیس کی شنوائی خوب طنطنے اور غلغلے سے ہوتی۔ ہمارا وجدان بتا رہا ہے کہ حکومت نے یہ کام اشارتنا اکادمی ادبیات کے سپرد کیا تھا۔ اب اکادمی سالِ فیض کے مضمرات کو ملحوظ رکھتے ہوئے پنڈی سازش کیس پر کانفرنس کا اہتمام نہیں کر سکی تو حکومت کا کیا قصور؟

البتہ فیض کانفرنس میں گورنر پنجاب جناب سردار محمد لطیف خان کھوسہ کی صدارت، کسی حد تک اکادمی کی اشارہ منہی کی دلیل ہے۔ اگر یہ کانفرنس پنڈی سازش کیس اور فیض احمد فیض کے زیر عنوان منعقد ہوتی تو لطیف کھوسہ صاحب اپنے خطبہ صدارت میں اس عزم کے ساتھ گورنری چھوڑنے کا اعلان فرماتے کہ وہ خود اس کیس میں وکالت کے فرائض سرانجام دیں گے۔ یا رلوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ منعقد شدہ فیض کانفرنس میں جناب گورنر کے خطبہ صدارت سے جس درجے کی 'پختگی' نکل رہی ہے، اس سے یہ مفروضہ تقویت پکڑ رہا ہے کہ ان کا استعفا ان کی جیب میں موجود تھا۔ یہ تو کانفرنس کے رنگ ڈھنگ اور خراجیات جیسے شگوفے کو دیکھتے ہوئے گورنر صاحب عین وقت پر مستعفی ہونے سے تائب ہو گئے، ورنہ آج تاریخ کا دھارا مختلف ہوتا اور براعنوان صاحب استعفیٰ دینے میں سہقت نہ لے جاسکتے۔